© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مارشل لا کے اٹھنے کے بعد اگست کے ترجمان القرآن میں ہم نے ملتِ اسلامیہ کے سامنے اُس دعوت کا تعارف کروایا تھا جس کی سربلندی کے سلیے جماعت اسلامی پھر منظم ہو کر جدوجہد کر رہی ہے۔ ان گزارشات کے آخر میں ہم نے کارکنوں کی خدمت میں یہ گذارش کی تھی کہ اس دعوت کے اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات، اپنے کردار اور باہمی تعلقات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اور اپنی پوری زندگی کو اُسی ایک رنگ میں رنگ لیں جسے قرآن مجید نے صبغۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے دو بنیادی صفات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی، توکل و استقامت اور دعوت کے برحق ہونے پر مکمل یقین و اعتماد۔ ان صفحات میں ہم اُسی سلسلہ کے تحت چند اور معروضات پیش کرتے ہیں۔

اِس دعوتِ اسلامی سے کسی کارکن کا تعلق کسی دفتری نوعیت کا نہ ہونا چاہیے کہ ایک آدمی مجبور ہو کر محض حالات کے دباؤ کے تحت بالکل بے بسی کے عالم میں اپنے اوپر ایک بوجھ لاد رہا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایک مسلمان کا رشتہ ایک "اضطراری تعلق" کا نہیں بلکہ محبت اور اخلاص کا رشتہ ہے۔ ایک شخص اگر اس کے ساتھ وابستگی میں ہی اپنی اور بنی نوع انسان کی دنیاوی اور اُخروی بھلائی سمجھتا ہے تو وہ بطیبِ خاطر خود آگے بڑھ کر اس کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے اور اگر اُس کے دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ اُس کے نزدیک فلاح و کامرانی کے کچھ دوسرے گُر اور کچھ دوسرے ہتھکنڈے ہیں تو اُسے پہلے انہیں آزما لینا چاہیے۔ اسلام کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک "ناگزیر بوجھ سمجھ کر" اٹھانے سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے اسلام دنیا میں آیا ہے۔ ایمان اور اعتقاد کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے اور یہ حیاتِ انسانی کے دو ایسے گوشے ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی جبر و اکراہ نہیں پا سکتا۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (البقرہ ۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے۔ تو جو کوئی طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لیے کوئی شکستگی نہیں اور اللہ بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ دین کا اصلاً تعلق چونکہ عقیدہ قلب سے ہے اور قلب پر جبر و اکراہ کی گنجائش ہی نہیں لہٰذا ایمان کا تعلق اپنے ارادہ و اختیار سے ہے، جبر و اضطرار سے نہیں۔

پھر اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِــيْمًا ۔

سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حکم نہ بنالیں اور جو فیصلہ آپ صادر فرمائیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اسے پورا پورا تسلیم کریں۔

ایمان کے دو اجزا ہیں پہلا جزو یہ ہے کہ ایک آدمی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جملہ معاملات کا حکم بنائے کیونکہ حضور کے فیصلے ہی ہر لحاظ سے برحق اور مبنی بر انصاف ہیں۔ دوسرے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ حضورؐ کے فیصلے سن کر انسان اپنے اندر کسی قسم کی دل گرفتگی محسوس نہ کرے۔ یہی کیفیت درحقیقت اُس کے ایمان کی اصل شہادت ہے۔ چنانچہ فقہائے امت نے اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو کوئی اللہ یا اُس کے رسول کے کسی حکم میں شک وشبہ کرے یا ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔[1]

ایمان جبر واکراہ نہیں، بلکہ تسلیم ورضا کا دوسرا نام ہے۔ انسان کے قلب میں یہ جڑ پکڑتا ہے، شعور ووجدان کے صاف اور شفاف چشمے اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ اخلاص اور محبت کی فضا اُسے پروان چڑھاتی ہے اور عمل پیہم، ایثار اور قربانی سے اسے قوت وطاقت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے ایمان کی اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ	ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور
اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ	رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے
بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا	مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	اطاعت کی، ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔

"سمع واطاعت" ہی درحقیقت ایمان کا اصل جوہر ہے اور اسی بنیاد پر اسلام کی رفیع الشان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ	اللہ کے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور
وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ	جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا

---

[1] وفی هذه الآية دلالة على ان من ردّ شيئا من اوامر الله تعالیٰ واوامر رسول الله صلی الله عليه وسلم فهو خارج من الاسلام سواء ردّه من جهة الشك فيه او من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم۔ (احكام القرآن، جصاص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللہ۔ ظاہر کرو اللہ اُس کا حساب لیگا

تو یہ بات حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کار پر کچھ گراں سی گزری۔ وہ آپ کے پاس آئے، اور آپ کی خدمت اقدس میں دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور بارگاہ نبوی میں عرض کی، یا رسول اللہ ہم پر وہ اعمال لازم کیے گئے تھے جن کی ہم میں طاقت اور قوت تھی مثلاً نماز، روزہ جہاد صدقہ اور اب یہ آیت نازل ہوئی ہے جس کے ہم اپنے آپ کو متحمل نہیں پاتے۔ اس پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اہل کتاب کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ تم تو یہ کہو: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔" (صحیح مسلم)

اس "سمع و اطاعت" کے لیے ایک مسلمان کے اندر جتنی تڑپ موجود ہوگی اتنا ہی اُس کا ایمان مضبوط ہوگا۔ اسی ایک فرض کی ادائیگی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے ہر قسم کے مصائب اور شدائد کا بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن اُن کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ پیدا ہوئی۔ بلکہ اس سمع و اطاعت اور تسلیم و رضا کے واقعات کا جب ہم آج بھی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بسا اوقات حیرت ہونے لگتی ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ آخر وہ کونسی روحانی لذت تھی جس کے حصول کے لیے حضور کے جاں نثاروں نے خود آگے بڑھ کر نہایت ہی والہانہ انداز میں جان جان آفریں کے حوالہ کی لیکن دین اور اُس کے لانے والے کے ساتھ اُن کی محبت اور وابستگی میں انہوں نے کسی قسم کی کمزوری نہ دکھائی۔ بلکہ اغیار کی طرف سے جتنا جبر و تشدد بڑھتا چلا گیا اُتنا ہی اُن کا ایمان مضبوط ہوتا گیا۔

محبت کی زنجیر کو تلوار کا وار کاٹنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے اور یہ وہ نشہ ہے جسے کوئی تعزیر اور خوف اتار نہیں سکتا۔ جب ایک انسان اس "مقدس جرم" میں گرفتار ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس سے رہائی پانے کی تمنا نہیں کرتا بلکہ اسے وہ اپنی زندگی کا اصل سرمایہ سمجھتا ہے اور اس جرم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پاداش میں اُسے جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ اُس کے عشق کو بڑھانے اور ترقی دینے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ تاریخِ اسلامی اس "ذوقِ جرم" کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ کس مسلمان کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ انہیں جب کفارِ مکہ نے شہید کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا تم مجھے اتنی مہلت دے دو کہ میں دو رکعت نماز ادا کر لوں۔ کفار نے اُن کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ آپ نے اس مقدس فرض کو ذرا عجلت سے انجام دیا اور کفار کو مخاطب ہو کر فرمانے لگے: قسم ہے خالقِ کائنات کی کہ اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تم میری نماز کی طوالت کو میری بزدلی پر محمول کرو گے تو میں اپنے مالک کے ساتھ کچھ دیر تک مزید سرگوشیاں کرتا لیکن میں نے اسے اس لیے جلدی ختم کیا ہے کہ تمہارے دلوں میں کہیں یہ احساس نہ پیدا ہو جاتے کہ میں موت کو اپنے سامنے پا کر گھبرا گیا ہوں۔ پھر آپ نے وہ مشہور اشعار پڑھے جن کے ابتدائی حصے میں کفار کے ہجوم کا ذکر ہے، درمیانی حصے میں اپنے خدا کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار ہے اور آخر میں عزم و ہمت اور شہادت کے شوق کا تذکرہ ہے۔ ہم یہاں ان اشعار کے صرف آخری حصے کو نقل کرتے ہیں۔ جن سے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی دلی کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے:

وَقَدْ خَيَّرُونِي الْكُفْرَ وَالْمَوتَ دُونَه
فقد ذرفت عَيْنَايَ من غيرِ مجزعٍ[1]

(انہوں نے مجھے کفر اور موت میں سے ایک چیز کا اختیار دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں لیکن یہ جزع فزع نہیں، خشیتِ الٰہی کے آنسو ہیں)

وَمَا بِيْ حِذَارُ الموتِ، انّي لميّتٌ
ولكن حذاري جحم نارٍ ملفعٍ

---

[1] اس لفظ میں اختلاف ہے۔ سیرت ابن ہشام میں یہ لفظ مُجْزَع ہے۔ لیکن زاد المعاد میں یہ لفظ مُدْمِع ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں (دیر یا سویر) مجھے بہر حال مرنا ہے۔ لیکن میں جہنم کے اُن شعلوں سے خوفزدہ ہوں جو دور دور تک لپیٹ میں لینے والے ہیں۔"

فواللّٰہِ ما ارجو اذا مامتُّ مسلمًا

علیٰ ایّ جنبٍ کان فی اللّٰہ مصرعی[1]

خدا کی قسم میری دلی آرزو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مَیں مسلمان (کی حالت میں) مروں اور میں (قتل ہو کر) جس پہلو بھی گروں، میرا گرنا اللہ ہی کے لیے ہو۔"

فلستُ بِمُبْدٍ للعدوِّ تخشّعًا

ولا جزعًا، انّی الی اللّٰہ مرجعی

"پس میں، دشمن کے سامنے کسی قسم کی ذلّت اور گھبراہٹ ظاہر کرنے والا نہیں۔ کیونکہ مَیں تو اپنے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں"

یہ اشعار بھی حضرت خبیبؓ کے عزم و استقلال کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں لیکن ان اشعار کے اختتام پر جب ابوسفیان نے حضور سرورِ دو عالمؐ کے بارے میں اُن سے ایک سوال کیا تو حضرت خبیبؓ نے اُس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایک مقدّس یادگار کے طور پر قائم رہے گا اور لوگ اسے سُن کر یا اسے پڑھ کر اپنے ایمان کا فیصلہ کیا کریں گے۔ راہِ حق کے اس شہید کے ان تاریخی الفاظ میں ایک مسلمان اپنے اخلاص، تعلق باللہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا صحیح طور پر اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ الفاظ دراصل ایمان کی کسوٹی اور دین سے وابستگی کا ایک بالکل صحیح پیمانہ ہیں۔

ابوسفیان اور حضرت خبیبؓ کے درمیان اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اسے ان کے الفاظ ہی میں سُنیے۔ حضرت خبیبؓ نے اپنے دلی جذبات کا جس انداز سے اظہار کیا ہے، الفاظ کا کوئی

---

[1] بعض نسخوں میں مضجعی ہے اور یہ شعر یوں نقل کیا گیا ہے:

ولستُ اُبالی حین اُقتل مسلمًا علیٰ ایّ شقٍّ کان فی اللّٰہ مضجعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھانچہ اُن کی ترجمانی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم اُن کے اصل الفاظ بھی نقل کرتے ہیں:

ابوسفیان نے کہا:

ایسرك ان محمداً عندنا نضرب عنقه وانك فی اهلك۔

کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اس وقت تم اپنے اہل و عیال میں زندہ ہوتے اور محمدؐ ہمارے پاس ہوتے اور ہم ان کی گردن مارتے (نعوذ باللہ)

اس سوال کے جواب میں اُس عاشقِ صادقؓ نے یہ فرمایا:[1]

لا واللہ، ما یسرنی انی فی اهلی وان محمداً فی مکانه الذی هو فیه تصیبه شوکة تؤذیه۔

(اے ابوسفیان! تم تو حضورؐ کی گردن مارنے کا ذکر کرتے ہو (یہ تو بڑی بات ہے) قسم ہے خدائے برتر کی، مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں (آرام سے) رہوں اور اُدھر حضورؐ کے مقدس پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے جو ان کے لیے اذیت کا باعث بنے۔

کونسا ایسا مسلمان ہے جس نے کفارِ مکہ کے لرزہ خیز مظالم کے تذکرے نہ پڑھے ہوں۔ اُن مظالم کا نقشہ جب آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی لوگوں کی نظروں سے کسی طرح اوجھل نہیں کہ ان مظالم کا تختۂ مشق بننے والے زیادہ تر وہ بے بس اور کمزور لوگ تھے جنہیں کسی طاقتور قبیلے کی تائید اور حمایت حاصل نہ تھی۔ وہ حضرات جن کا تعلق کسی مضبوط قبیلے سے تھا اُن پر ستم ڈھائے تو جاتے لیکن اُن کے معاملے میں کفار اتنے جری اور بیباک نہ ہوتے جتنے کہ ان بے سہارا لوگوں کے معاملے میں تھے۔ چنانچہ ان مظلوموں کی بے کسی کو دیکھ کر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ لیکن تاریخ کے بہت سے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

[1] زاد المعاد جلد دوم صفحہ ۲۷۹

© rasailojaraid.com